معین الدین عقیل*

مشفق خواجہ :
تحقیق و تخلیق کے انقلابی موڑ

مشفق خواجہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیت اور حیثیت ان کے انتقال کے بعد سے اب تک موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ ابھی رواں رہے گا۔ ایک عام انسانی حیثیت میں ان کی شخصیت کا محض سماجی پہلو بھی ہر ایک کے لیے پرکشش رہا ہے۔ ان کا لب ولہجہ، طرزِ گفتار، شرینیِ کلام، رکھ رکھاؤ، خوش پوشاکی، یہ سب ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ٹیلی فون وصول کرتے ہوئے ایک عام روایت کے برعکس ''ہیلو'' کے بجائے ان کا ''فرمایئے'' یا ''جی فرمایئے'' کہنا ایک اجنبی مخاطب کو اسی لمحے زیر کرنے کا باعث بن جاتا۔ گفتگو میں یہ شان بھی رہتی کہ انگریزی کا عام سے عام اور مروج سے مروج لفظ بھی شاذ ہی ان کی زبان سے نکلتا۔ صرف شفاف و شائستہ زبان محفل میں انھیں سب سے مختلف کیے رکھتی۔ لباس کے معاملے میں بھی ان کا رکھ رکھاؤ دیدنی رہتا۔ جہاں مکلّف لباس ضروری ہوتا وہ موقع و محل کی مناسبت سے لباس کو بڑی عمدگی اور سلیقے سے پہنتے اور اس کے لیے خاصا اہتمام بھی کرتے۔ چاہے اس اہتمام میں انھیں تاخیر ہی کیوں نہ ہو جائے اور جھوٹے سچے بہانے ہی کیوں نہ بنانے پڑ جائیں۔ لیکن شام کو محض یوں ہی ٹہلنے نکلتے تو عام سا لباس زیب تن کیے رکھتے اور یہ عموماً کرتا پائے جامہ ہوتا۔ شلوار میں کبھی میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ سفید پائے جامہ پہنتے۔ کرتوں کے لیے رنگ کی قید نہ ہوتی اور عام طور پر ہلکے رنگوں کے اور بالعموم بوسکی کے ہوتے جو بغیر کالر اور کھلے آستین، یعنی بغیر کف والے ہوتے۔

* ڈاکٹر معین الدین عقیل، سابق صدر، شعبہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

گھر میں تنہا رہتے تو عموماً گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان میں رہتے' مگر جب کوئی ملنے والا آ جاتا تو اس کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے کرتا پہن لیتے۔

پینتیس۔چھتیس سالہ رفاقت میں صرف ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے انھیں کئی گھنٹے صرف بنیان میں دیکھا اور وہ بھی گھر یا تخلیے میں نہیں، ریل گاڑی کے بھرے ڈبے میں سفر کرتے ہوئے! یہ شدید گرمی کا موسم تھا اور مشفق خواجہ' رقم الحروف اور ہمارے ایک بہت قریبی مشترک دوست سید اظہر الحق حقی (پروفیسر اور پرنسپل، شپ اونرز کالج، کراچی، مگر اس وقت محض ایک نوجوان لیکچرر۔ پیدائش: ۱۹۴۷ء) اپنی بیگمات کے ساتھ' تین دن نواب شاہ میں محمد یعقوب خان خویشگی کے آموں کے باغ میں گزار کر اور اسی باغ میں واقع ان کا ذاتی کتب خانہ بالاستیعاب دیکھ کر بذریعۂ ریل کراچی واپس جا رہے تھے۔ ریل کا یہ سفر دن کے ان پہروں کا تھا جب شدید گرم موسم میں دھوپ اور گرمی بلا کی ہوتی ہے۔ پھر سندھ کا ریگستانی علاقہ۔ نواب شاہ سے ائرکنڈیشنڈ ڈبے میں جگہ کا ملنا ناممکن تھا۔ چناں چہ لوکے تھپیڑوں میں خواجہ صاحب کے لیے گرمی کا برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ ان کی حالت غیر ہوگئی۔ چناں چہ وہ اس حد تک بے حال ہو گئے کہ انھوں نے کرتا اتار دیا اور ایک تولیا بھگو کر سر پر اوڑھ لیا اور سارا راستہ اسی عالم میں بار بار تولیا بھگو کر سر پر اوڑھتے اور کھلے دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے مگر چین انھیں پھر بھی نہ آتا تھا۔

ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں نے انھیں ہمیشہ دوسروں سے ممتاز اور مختلف رکھا۔ یہی حیثیت علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں ان کی رہی۔ مطالعہ، بالخصوص قدیم اور جدید اردو ادب کا بے پناہ اور حافظہ بھی غضب کا تھا۔ اس لیے اپنی معلومات کے لحاظ سے محفل میں سب میں نمایاں رہتے۔ اظہار کے معاملے میں تخلیق اور تحقیق دونوں میں دل چسپی رہی۔ فطری طور پر طبع موزوں بھی رکھتے تھے اور ایک زمانے تک، یعنی نوجوانی سے کوئی پچاس سال کی عمر تک، شعر کہتے رہے اور مزاج کو غزل ہی سے مناسبت رہی۔ اپنے عہدِ جوانی میں اپنی غزل پر انھیں اعتماد بھی رہا کہ جب ان کی غزلیں ان کے دوست اور احباب کے وسیلے سے' جو ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے' گلوکاروں نے ریڈیو کے لیے گائیں تو وہ سرخوشی میں ان کا ذکر ان لوگوں سے بھی کر دیتے جو ریڈیو نہیں سنتے تھے یا موسیقی سے کوئی خاص لگاؤ نہ رکھتے تھے۔ جب ان کی غزلوں کا مجموعہ *ابیات* شائع ہوا۔ تو وہ بڑے شوق سے اس کی اشاعت اور تقسیم کا خود اہتمام کرتے رہے۔

کتابت اور سرورق کی دل کشی و خوبصورتی کے لیے انھوں نے خاصے جتن کیے۔ یہ سارا اہتمام سید اظہر الحق حقی کے برادر نسبتی کے پریس واقع لیاقت آباد (کراچی) میں ہو رہا تھا۔ طباعت کے مرحلے میں جب کاپیاں اور سرورق چھپ کر آیا تو وہ خواجہ صاحب کے معیار سے کم تر تھے۔ خواجہ صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور سب کو رد کر دیا اور پھر سب کچھ دوسرے پریس میں چھپوایا۔

ان کا یہ عمل اور روّیہ ان کی نفاست پسندی' خوش ذوقی اور اپنے شعری مجموعے کو عمدگی سے پیش کرنے کی ایک مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، لیکن چند ہی برسوں میں ان میں یہ نمایاں تبدیلی بھی آئی کہ جب *ابیات* کا وہ ایڈیشن ختم ہو گیا اور ان کی اس جانب توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کی اگلی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اب یوں لگتا تھا کہ انھوں نے شعر گوئی سے دلچسپی ہی لینی چھوڑ دی تھی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ بازار میں *ابیات* کے جو بچے کھچے نسخے موجود تھے' انھوں نے انھیں بھی واپس منگوا لیا تھا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ میرے ذریعے سے *ابیات* کے ایک دو نسخے انھوں نے جاپان (پروفیسر سوزوکی تاکیشی اور پروفیسر اسادا یوتاکا) کو بذریعۂ ڈاک بھجوائے تھے لیکن جب وہاں سے کوئی رسید نہ آئی تو وہ ایک عرصے تک مجھ سے پوچھتے رہے کہ ''وہاں سے کوئی رسید آئی؟، پوچھ لیجیے کہ انھیں کتاب مل گئی''۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ تحریر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ میں عمر اور مرتبے میں ہر لحاظ سے ان سے چھوٹا تھا لیکن ہمارے درمیان رشتہ بے تکلفانہ اور غیر رسمی رہا مگر انھوں نے مجھے ہمیشہ ''آپ'' ہی کہہ کر مخاطب کیا۔ مولانا ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور سعید احمد (کارکن انجمن ترقی اردو اور افسانہ نگار مشرف احمد کے برادر خورد) بھی ان کے بہت قریب رہے' بلکہ ان کے قرب کا عرصہ میرے مقابلے میں زیادہ طویل تھا، لیکن انھیں بھی' ان کے خاصا کم عمر ہونے کے باوجود' وہ ''آپ'' ہی سے مخاطب کرتے۔ میں نے کسی کو انھیں ''تم'' سے مخاطب کرتے ہوئے نہ سنا۔ ہاں' اگر وہ کسی کو ''تم'' کہتے تھے تو وہ یا تو ان کی ''بیگم'' تھیں یا ان کے گھر کے اور انجمن ترقی اردو کے ملازم تھے یا پھر یہ حیران کن ہے کہ سید یوسف بخاری تھے! یوسف بخاری' دلّی کا روڑا، شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، اشرف صبوحی کے معاصر اور رفیق۔ خواجہ صاحب سے عمر میں شاید بیس پچیس برس زیادہ ہی ہوں گے' یہ عقدہ کبھی نہ کھلا کہ خواجہ صاحب فقط یوسف بخاری کو ہی کیوں ''تم'' سے مخاطب کرتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی یوسف بخاری کو ''آپ'' سے مخاطب کرتے

ہوئے نہ سنا! جب کہ وہ ہوٹل کے بیرے کو بھی، عام ٹھیلے والوں کو بھی، ''آپ'' ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ تخلیق کی مناسبت سے، شاعری سے قطع نظر، کہ جسے ایک وقت خود انھوں نے ترک بھی کر دیا اور جو کچھ لکھا، اس سے بھی صرف نظر کرنے لگے، ان کی کالم نگاری یقیناً ان کی ادبی و تخلیقی شخصیت کا ایسا وصف ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ یادگار رہے گا۔ ادبی موضوعات اور شخصیات پر لکھے ہوئے ان کے کالم اردو زبان میں یا ادبی کالم نویسی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ ہمیشہ دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ سیاسی شخصیات پر لکھے ہوئے ان کے دور اول کے کالم بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشفق خواجہ کی اصل شہرت، ان کی شخصیت اور ان کے دیگر ادبی کاموں سے قطع نظر، ان کی کالم نویسی ہی کے باعث عام ہوئی ہے۔ شاعری کو ان کا امتیاز نہیں کہا جا سکتا اور اس کے حوالے سے ان کی شہرت اور ان کا مقام شاید قابل لحاظ کبھی نہ رہے۔ تحقیق یقیناً ان کا ایک امتیاز ہے اور اس حوالے سے ان کی شہرت اور ان کا مقام شاید قابل لحاظ بھی ہے، مگر عوام یا عام افراد کے لیے مشفق خواجہ کچھ تھے' تو وہ ان کے مقربین کے لیے ان کی شخصیت کے دل نشین اوصاف کے باعث تھے یا ان کی کالم نویسی کے باوصف۔

اس میں شاید اب کوئی کلام نہیں کہ واقعی مشفق خواجہ کی مثالی شہرت کا دار و مدار ان کی کالم نویسی تھی اور یہی کالم نویسی انھیں تادیر زندہ بھی رکھے گی، لیکن کیا واقعی مشفق خواجہ محض ایک کالم نگار کے طور پر ہی یاد کیے جائیں گے؟ *جائزۂ مخطوطات اردو*[۲]، *تحقیق نامہ* (کے بلند پایہ تحقیقی مقالات)[۳]، *غالب اور صفیر بلگرامی*[۴] کے مصنف کو، جس نے *تذکرۂ خوش معرکہ زیبا*[۵]، *اقبال* (از احمد دین)[۶] اور *کلیات یگانہ*[۷] جیسے متون بھی مرتب و مدون کیے' کیا دنیا جلد بھول جائے گی؟

جائزۂ مخطوطات اردو کے شائع ہونے سے قبل ہی مشفق خواجہ ایک ''محقق'' کی حیثیت میں معروف ہو چکے تھے۔ انجمن ترقی اردو اور اس کے اس وقت کے مؤقر تحقیقی مجلّے *اردو* سے وابستگی کے عرصے میں ان کے تحقیقی مقالات نے، جو *اردو*[۸]، *صحیفہ*[۹] اور *اقبال ریویو*[۱۰] میں چھپ چکے تھے، انھیں ایک زیرک' وسیع المطالعہ اور سنجیدہ اسلوب کے حامل ایک ایسے محقق کے طور پر متعارف کروا دیا تھا' جس کے مثالی کارنامے: *جائزۂ مخطوطات اردو* کی اشاعت نے ان سے تحقیقی اور علمی دنیا کو ایسی توقعات وابستہ کرنے کی تحریک دی' جیسی کبھی امتیاز علی عرشی

(۱۹۸۱ء-۱۹۰۴ء)، حافظ محمود شیرانی (۱۹۴۶ء-۱۸۸۰ء)، اور قاضی عبدالودود (۱۹۸۴ء-۱۸۹۶ء) سے وابستہ کر لی گئی تھیں اور جسے ان بزرگوں نے پورا بھی کر دکھایا تھا۔ چناں چہ یہ سوالات مشفق خواجہ کے چاہنے والوں، ان سے وابستہ رہنے والوں اور تحقیق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں کے ذہنوں اور جائزوں و مطالعوں میں گردش کرتے رہے ہیں اور آج بھی گردش کر رہے ہیں کہ کیا مشفق خواجہ نے *جائزۂ مخطوطات اردو* کی اشاعت کے بعد تحقیق کی دنیا میں ان سے وابستہ توقعات کو پورا کیا ہے؟ ورثے میں ملنے والے ایک وقیع اور نادر و مفید کتب خانے کے مالک نے، کہ جس کتب خانے کے پھیلاؤ میں خود اس کی زندگی بھر کی اپنی دل چسپی اور لگن بھی شامل رہی ہو، اور ایک بے حد وسیع المطالعہ شخص نے' جسے مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ء-۱۸۸۰ء) جیسے محقق کی صحبت بھی میسر آئی تھی اور جس نے مولوی عبدالحق، سخاوت مرزا (۱۹۷۷ء-۱۸۹۸ء) اور افسر صدیقی (متوفی ۱۹۸۴ء) جیسے محققین کی شفقتوں کے زیر سایہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہو، کیا اس کے پیش کردہ کل تحقیقی سرمایے میں فقط اتنا ہی کچھ ہونا چاہیے تھا؟ اور کیا تحقیق میں انھوں نے اتنے ہی بڑے کام کیے جتنے وہ اس حوالے سے مشہور و معتبر ہوئے؟

یہ اور ایسے دیگر متعدد سوالات میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور حیثیت کے بارے میں جو اخلاص اور دل بستگی ہے وہ مخفی نہیں، نمایاں ہے۔ میری طرح کے ان کے وابستگان میں، جو خواجہ صاحب سے نسبت و محبت بھی رکھتے ہیں اور ان کے تحقیقی کارناموں کے معترف اور وکیل بھی ہیں' ان سوالات کے جوابات کو مشفق خواجہ کے حق میں کم ہی دیکھ پاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب *جائزۂ مخطوطات اردو* شائع ہوا تو بعض اکابر اور خود راقم الحروف نے، اس وقت اس پر تبصرہ لکھا تھا تو اس کے فاضل محقق کو اردو کا بروکیلمن (C. Brokelmann، ۱۹۵۶ء-۱۸۶۸ء)[۱۱] اور سی۔اے اسٹوری (C. A. Storey، ۱۹۶۷ء-۱۸۸۸ء)[۱۲] قرار دیا تھا، جو علی الترتیب عربی اور فارسی مخطوطات و مطبوعات کے بے مثل فہرست ساز گزرے ہیں۔ *جائزۂ اردو مخطوطات* خواجہ صاحب کی اس سلسلے کی پہلی جلد تھی اور سرورق اور پیش لفظ میں بھی اسے پہلی جلد ہی لکھا گیا تھا۔ خود مشفق خواجہ بھی اس کی دوسری بل کہ اگلی جلد کے مواد کے یکجا کر لینے اور اسے ترتیب دینے کا ذکر کرتے رہتے تھے، اور دوسری جلد کے بارے میں ایک وقت یہ بھی کہنے لگے تھے کہ مسودہ ناشر (''مرکزی اردو

بورڈ''، لاہور) کو بھیج دیا گیا ہے۔ لیکن پھر یہ بھی سنا کہ مشفق خواجہ کی کچھ اضافی شرائط کو اس وقت کے ناظم اور مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد (۲۰۰۴ء۔۱۹۲۵ء) نے منظور نہ کیا، چناں چہ وہ مسودہ واپس آ گیا۔ پھر برسوں بعد یہ بھی سنا کہ وہ مسودہ مقتدرہ قومی زبان کو بھیجا گیا، لیکن اس زمانے میں کئی برسوں کے لیے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا، جس کے باعث بعد میں کوئی اطلاع راست مشفق خواجہ سے مجھے نہ مل سکی۔ یہ ساری باتیں محض اس جائزہ کی دوسری جلد کی اشاعت کے بارے میں سننے میں آتی رہیں، بقیہ مزید جلدوں کے بارے میں خود مشفق خواجہ نے کبھی کچھ نہ کہا۔ جب کہ کراچی کے قومی عجائب گھر کے اردو مخطوطات، جس پر اس جائزہ کی اگلی جلدوں کو مشتمل رہنا تھا، اس جلد اول میں محض آٹھ دس فیصد سمیٹے جا سکے تھے۔

ایسا ہی کچھ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے بارے میں بھی کبھی خواجہ صاحب بتایا کرتے تھے اور اس کے پیش لفظ میں بھی تحریر ہے کہ اس کے تعلیقات کی جلد جو اس طرح اس تذکرہ کی تیسری جلد ہوگی، وہ تحریر کر چکے ہیں اور یہ مجلس ترقیٔ ادب ہی سے، جہاں سے اس کی دو جلدیں چھپی تھیں، شائع ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ بھی اس قدر تاخیر کا شکار ہوا کہ یہ تیسری جلد شائع نہ ہوئی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ دراصل اس تذکرے کے تعلیقات خواجہ صاحب نے مقالات کی صورت میں، اولاً سہ ماہی غالب (کراچی) میں ''پرانے شاعر نیا کلام'' کے زیر عنوان شائع کرانے شروع کر دیے تھے، اور چند شائع بھی ہوئے [۱۳] لیکن پھر جتنے مقالات اس صورت میں مکمل ہوئے انھیں تحقیق نامہ میں شائع کر دیا گیا۔ اس طرح یہ جائزہ اور یہ تذکرہ دونوں نامکمل رہے اور خواجہ صاحب کے وعدے اور منصوبے بوجوہ تشنہ رہ گئے۔

تحقیق میں مشفق خواجہ کے یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ مثالی اور ممتاز ہیں لیکن وہ توقعات جو اردو کے بروکیلمن اور سی۔ اے اسٹوری سے ان کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں نے ان سے وابستہ کر لی تھیں، افسوس وہ پوری نہ ہو سکیں۔ مولوی احمد دین کی تصنیف اقبال اور کلیات یگانہ کی تدوین ان کی تحقیق میں چوتھے اور پانچویں بڑے کام تھے جو خود ان کے بقول ان کی تیس سالہ جستجو اور محنتوں کا ثمر تھے، لیکن کیا یہ جائزہ اور تذکرہ کے معیار کے کام تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے دو جواب ملتے ہیں۔ دو جوابوں کا ہونا ہی مشفق خواجہ کی اصل حیثیت کے تعین کے لیے، جو اگر تحقیق کے حوالے سے ابھری تھی، کچھ خوش کن اور قابلِ اطمینان نہیں۔ جائزہ اور تذکرہ قریب

قریب ایک ہی عرصے میں یکے بعد دیگرے سامنے آئے تھے۔ بعد میں تحقیق کے زمرے میں خواجہ صاحب کے صرف چند مقالات شائع ہوئے، جو قوی گمان ہے کہ دراصل تذکرہ کے تعلیقات ہی تھے لہٰذا انھیں تذکرہ ہی کا ذیلی کام سمجھا جانا چاہیے۔ غالب اور صفیر بلگرامی بھی دراصل کوئی مستقل تصنیف نہیں، یہ بھی مقالات کا مجموعہ ہی ہے، جو ان کی جستجو اور ان کی محنت کے مثالی ثبوت ہیں۔ مگر کیا تحقیق کی دنیا کو اتنا کچھ مل گیا، جو مشفق خواجہ دے سکتے تھے؟ یہ زیادہ بڑا سوال ہے۔ ایسا ہی ایک وعدہ اور منصوبہ بہاالدین بشیر کے تذکرے کی ترتیب و تدوین کا بھی تشنہ اور نامکمل رہ گیا، جس پر وہ ایک معرکتہ الآرا مقالہ لکھ چکے تھے [۱۴] اور پھر وہ بقول خود کئی برس اس کی تدوین میں مصروف رہے۔ ایسا ہی معاملہ تذکرہ گلشن مشتاق [۱۵] کے ساتھ بھی رہا۔ آخری برسوں میں ان دونوں تذکروں کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔

میرے زاویے سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مشفق خواجہ اگر جائزہ کی اگلی جلدیں مکمل کر پاتے تو اردو کو ایک بروکیلمن اور اسٹوری تو دے ہی سکتے تھے۔ یا کم از کم سطح پر تذکرہ اور صفیر بلگرامی اور غالب جیسی اور تصانیف تو دے ہی سکتے تھے اور اس طرح عرشی صاحب، شیرانی صاحب اور قاضی صاحب نہ سہی، مسعود حسن رضوی ادیب (۱۹۷۵ء۔۱۸۹۳ء) اور مالک رام (۱۹۹۳ء۔۱۹۱۲ء) کی صف میں تو ضرور ہی شامل ہو سکتے تھے، اور شاید سرفہرست رہتے، لیکن افسوس ایک بڑے ابھرتے ہوئے اور صف اول میں جگہ پاتے ہوئے محقق کو، کئی اسباب ہیں کہ جنھوں نے اپنے راستے سے ہٹا کر دوسرے راستوں پر چلنے پر مجبور یا آمادہ کر دیا اور یوں ایک بڑا امکانہ محقق ہم سے چھن گیا۔

جہاں تک اس کے اسباب یا ان سے متعلق سوال کا تعلق ہے، میں خود کو اس کا جواب دینے کا پابند سمجھتا ہوں اور بڑی ذمے داری اور سنجیدگی سے کہہ سکتا ہوں کہ مشفق خواجہ کو ''تحقیق'' سے اولاً عطاالحق قاسمی (۔۱۹۴۳ء) نے اور پھر ادا جعفری (۔۱۹۲۴ء) نے دور کر دیا! یہ باتیں سب ہی قارئین کے لیے حیران کن بلکہ چونکا دینے کا باعث ہو سکتی ہیں، لیکن میں مشفق خواجہ کو پینتیس۔ چھتیس سالوں تک بہت قریب سے، بلکہ انتہائی قریب سے، اور روزمرہ مشاہدے کی حد تک غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات اور روابط کی نوعیت پر میری دو تحریروں: مشفق خواجہ کے آخری دس دن [۱۶] میں کسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ تحریریں

محض اشاروں پر مشتمل ہیں۔ تعلقات کے اس طویل عرصے میں کم ہی ایسی شامیں یا ایسے دن گزرے ہیں جب ہم کراچی میں ہوں اور نہ مل سکے ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ خواجہ صاحب دن بھر گھر میں اپنے کام کرتے رہتے اور وہ زمانہ جائزۂ مخطوطات اردو اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کی تکمیل واشاعت اور غالب اور صفیر بلگرامی، اقبال اور کلیات یگانہ کی تدوین وترتیب کا تھا۔ وہ دن بھر یہ کام کرتے لیکن شام کو دن بھر کی تھکن اتارنے، تازہ دم ہونے اور ہوا خوری کے لیے گھر سے نکل پڑتے اور قریب ہی غالب لائبریری پہنچتے ' جہاں میں اور مرزا ظفر الحسن مرحوم (۱۹۸۴ء۔۱۹۱۶ء) ان کے منتظر ہوتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہم وہیں ساتھ رہتے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتیں' مرزا ظفر الحسن سے خوش گپیاں ہوتیں اور خواجہ صاحب سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہتے۔ مرزا صاحب تو رات ۹ بجے لائبریری بند کروا کر گھر کے لیے روانہ ہو جاتے اور ہم دونوں یا اور جو بھی اس وقت ہمارے ساتھ ہوں، مرزا صاحب کو رکشہ یا ٹیکسی میں بٹھا کر کسی اور طرف نکل جاتے یا بالعموم کسی ریستوران میں جا بیٹھتے اور یوں تقریباً ۱۱ بجے تک ساتھ رہتے۔ ان ہی شاموں میں خواجہ صاحب کبھی کبھی دوستوں کی دعوتوں میں، مخصوص محفلوں اور تقریبات میں بھی شریک ہوتے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا اور وہ ان دنوں تواتر کے ساتھ اپنے تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں دن بھر مصروف رہتے۔ ہاں ان ہی میں تقریباً دو اڑھائی برس ایسے بھی گزرے جب خواجہ صاحب روز ہی صبح گھر سے نکل کر قومی عجائب گھر (کراچی) جاتے اور وہاں عجائب گھر کے دفتری وقت کے خاتمے تک بیٹھے جائزہ کا کام کرتے رہتے۔

اس دوران ہماری گفتگوؤں کا محور عام طور پر کلاسیکی ادب، نئی پرانی کتابوں اور پھر مختلف موضوعات پر کتب حوالہ یا مآخذ کی تلاش وجستجو پر مشتمل رہتا۔ بھارت سے کتابوں کی آمد کا ایک مستقل سلسلہ ان کے ہاں جاری رہتا۔ وہ ہر اہم کتاب یا مصنف کے بارے میں مجھے ضرور اطلاع دیتے اور اسی طرح مجھ سے، کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن کتابوں کی دوکانوں پر ضرور جاتا تھا، دریافت کرتے رہتے کہ کون کون سی اہم نئی کتابیں آئی ہیں یا کونسی پرانی یا کمیاب و نادر کتابیں دستیاب ہوئی ہیں؟ لیکن پھر یکا یک مشفق خواجہ میں ایک تبدیلی بہت واضح اور نمایاں دیکھنے میں آئی اور اس کا محرک یا سبب میں عطا الحق قاسمی کو سمجھتا ہوں۔

ہوا یوں کہ عطا الحق قاسمی نے بیٹھے بٹھائے اپنا ایک ادبی مجلّہ معاصر جاری کر دیا۔ یہ

۱۹۷۹ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔ اس کا پہلا ہی شمارہ ضخیم، پرکشش اور متنوع تحریروں پر مشتمل شائع ہوا تو اس کا بڑا چرچا ہوا۔ کچھ تو رسالے ہی کی کشش، کچھ قاسمی صاحب کی عوامی رابطے کی قابل رشک صلاحیتوں اور صحافت اور صحافیوں کے ساتھ ان کی وابستگی' چناں چہ معاصر کے چرچے کراچی کے ادبی حلقوں تک میں ہونے لگے۔ کراچی میں یہ بیک وقت خواجہ صاحب اور راقم الحروف کو موصول ہوا۔ میں اس وقت اخبار جسارت کے ادبی صفحے کو مرتب کیا کرتا تھا۔ اس پر پہلے اس میں ایک خبر شائع ہوئی' پھر ایک تبصرہ بھی چھپا۔ خبریں اور تبصرے دوسرے اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہوئے اور تعارفی تقاریب بھی تقریباً ہر بڑے شہر میں منعقد ہوئیں۔ ان سب کے چرچے کراچی میں پہنچنے لگے' پھر اس پر مستزاد ایک تعارفی تقریب خاصے زور وشور سے کراچی میں بھی منعقد ہوئی۔ قاسمی صاحب نے بہ اصرار مشفق خواجہ صاحب کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا۔ اور اس طرح اصرار کیا کہ خواجہ صاحب راضی ہو گئے۔ خواجہ صاحب کبھی اس طرح کی تقریبات میں شریک نہ ہوتے اور اگر شریک ہوتے تو تنہا نہ جاتے، کسی کو ساتھ لے جاتے۔ میں بھی ایسی تقریبات سے گریز ہی کرتا ہوں لیکن خواجہ صاحب نے کہ خود بھی اس میں جانا چاہتے تھے، مجھ سے بھی اصرار کیا، چناں چہ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا اور پاشا رحمٰن (انکم ٹیکس آفیسر اور شاعر، جن کے نام معاصر کا پہلا شمارہ معنون تھا۔) اور اظہر الحق حقی بھی ہمارے ساتھ چلے۔ اس تقریب میں ہونا کیا تھا، ظاہر ہے تعریفیں ہوتی رہیں اور عطا الحق قاسمی کے عزم اور حوصلے کو داد دی جاتی رہی کہ اتنا ضخیم' متنوع اور پرکشش رسالہ جاری کیا ہے۔ خواجہ صاحب اس بات سے متفق نہ تھے یا زیادہ خوش نہ تھے۔ رسالہ دیکھتے ہی انھوں نے کسی مثبت تاثر کا اظہار نہ کیا تھا۔ دوران تقریب بھی وہ دبے لفظوں میں استہزا ہی کرتے رہے لیکن تقریب کے بعد ہم وہاں سے نکل کر آرٹس کونسل کے ریسٹوران میں چائے پینے کے لیے پہنچے اور وہاں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اس وقت دورانِ گفتگو خواجہ صاحب نے کھلے لفظوں میں کہا کہ معاصر میں کوئی خاص بات نہیں، اس سے اچھا رسالہ تو میں نکال سکتا ہوں۔ چناں چہ یہ جملہ تخلیقی ادب کے اجرا کا محرک ثابت ہوا۔ پھر انھوں نے زیادہ وقت بھی نہ لگایا اور ایک ہی سال میں، ۱۹۸۰ء میں، اس کے بیک وقت دو شمارے مرتب کر لیے اور شائع بھی کر دیے۔

وہ دن تھا اور اس کے بعد کئی برسوں تک مشفق خواجہ بس تخلیقی ادب کے ہو کر رہ گئے۔

اب ان کی گفتگو کا محور، ان کے معمولات، ان کی دل چسپیاں سب کچھ تخلیقی ادب سے منسلک ہو کر رہ گئیں۔ اب ان کا اوڑھنا بچھونا تخلیقی ادب کے نکالنے، اس کے لیے ہر طرف سے، ہر ایک سے، مضامین اور نگارشات حاصل کرنے اور اس کے متعلقہ انتظامات میں سمٹ کر رہ گیا۔ جتنے عرصے تک تخلیقی ادب نکلتا رہا، ان کی ساری سرگرمیوں اور گفتگو کا محور وہی رہا۔ ان کے معمولات بھی اسی کے گرد گھومتے رہے۔ اس وقت سے تحقیق سے ان کا رشتہ قریب قریب ٹوٹ گیا۔ جائزۂ مخطوطات کی تکمیل کے لیے وہ روز عجائب گھر جایا کرتے تھے اب وہ موقوف ہو گیا۔ اب جب مجھ جیسے نیاز مندان جائزہ کی دوسری جلد اور تذکرہ کے تعلیقات کا ذکر چھیڑتے اور استفسار کرتے تو شاید اس کا اثر تھا کہ انھوں نے پہلے غالب اور صفیر بلگرامی سے متعلق اپنے مقالات کو یکجا کر کے پہلے یہ کتاب اور پھر دیگر مقالات کو جمع کر کے تحقیق نامہ شائع کر دیا، یا پھر احمد دین کی کتاب کا مقدمہ مکمل کر کے اس کتاب کو چھپوا دیا، لیکن نامکمل کاموں اور اگلے منصوبوں کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور پھر کبھی وہ کسی تشنہ یا زیر نظر منصوبے، جیسے تذکرۂ بشیر کی تدوین، کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ جائزۂ مخطوطات کے کام کے دوران انھیں جہاں تذکرۂ بشیر میں کشش محسوس ہوئی تھی وہیں ایک نادر لکھنوی روزنامچے فرمانِ سلیمانی کو بھی مرتب کرنے کا پختہ ارادہ انھوں نے کر لیا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے والد خواجہ عبدالوحید کی ڈائری یادایام کو بھی مرتب کرنے کے لیے مواد یکجا کرتے رہے۔ مؤخر الذکر دونوں کاموں کو وہ تخلیقی ادب کے بند ہونے کے بعد کہیں شروع کر سکے لیکن ان کی حیات تک ان کی نوک پلک درست نہ ہو سکی، جس کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد ان دونوں روزنامچوں کے شائع ہونے سے ہوتا ہے [۱۷]۔ حقیقتاً ان دونوں کے حواشی اور تعلیقات، جو اگر اتنے ہی تھے جو شائع ہوئے ہیں، تو نہیں لگتا کہ یہ مشفق خواجہ کے شایان شان تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ خواجہ صاحب کے تحقیقی مزاج اور معیار کا وہ تسلسل، جو ان کے اولین کاموں کے وقت تھا، وہ تخلیقی ادب سے 'ہنی مون'' کے زمانے میں ٹوٹ گیا تھا، اور پھر کبھی بحال نہ ہو سکا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ تخلیقی ادب نے بلکہ معاصر اور عطا الحق قاسمی نے دراصل ایک بڑے محقق کو تحقیق کے ''خارزاروں'' سے نکال کر ایک عمومی ادبی حلقے میں، جو پاکستان سے نکل کر بھارت تک میں وسعت اختیار کر گیا تھا، شہرت، مقبولیت اور تحسین و ستایش کے نشے سے سرشار کر دیا کہ تحقیق، یہاں تک کہ تشنہ اور باقی ماندہ منصوبے بھی، اس کے لیے اب وہ نہ رہے، جو کبھی ہوا کرتے تھے۔

اس پر مستزاد مشفق خواجہ کے لیے ادا جعفری کا اسلام آباد سے مستقلاً کراچی منتقل ہو جانا بھی ایک بڑا ''حادثہ'' ثابت ہوا! ایک اچھی اور سنجیدہ شاعرہ کے علاوہ ادا جعفری ایک عمدہ منتظم اور سماجی لحاظ سے ایک بھرپور شخصیت کی حیثیت میں اسلام آباد کے ادبی حلقوں میں معروف اور سرگرم رہیں، اور ایک مخصوص و محدود حلقے میں وہاں ایک 'حلقہ' یا 'دائرہ' یا 'سلسلہ' کی صورت میں ادیبوں اور دانش وروں کے گھریلو اجتماعات کا اہتمام اس حلقے سے وابستگان کے دولت کدوں پر کرواتی رہیں۔ ان کے خاوند نورالحسن جعفری (۱۹۹۵ء-۱۹۲۱ء) سرکار دربار میں اپنے سرکاری منصب کی وجہ سے قدر و منزلت اور رسائی رکھتے تھے۔ اس لیے اسلام آباد کا مؤقر طبقہ ان کے حلقے میں شامل تھا۔ اس حلقے کے اجتماعات کی شہرت کراچی تک پہنچی ہوئی تھی۔ نورالحسن جعفری صاحب کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد یہ میاں بیوی ۱۹۸۱ء میں اپنی مستقل رہائش گاہ کراچی میں منتقل ہو گئے اور یہاں آنے کے بعد انھوں نے اس حلقے کی کراچی میں ترتیب نو کی، جس کے نتیجے میں یہاں کے اکابر ادیبوں اور دانش وروں کے اجتماعات کا ایک سلسلہ یہاں بھی شروع ہو گیا۔ مرزا ظفر الحسن مرحوم، جو بوجوہ اس حلقے میں متواتر شریک نہ ہوتے، اس کو بطورِ مذاق ''امپیریل ادیبوں کا حلقہ'' کہا کرتے تھے۔ راقم کو بھی اس حلقے میں دو ایک بار شرکت کا موقع ملا ہے۔

یہ اجتماعات متعلقہ اراکین کے دولت کدوں پر یکے بعد دیگرے منعقد ہوتے اور ان کا درمیانی وقفہ بالعموم دو تین ہفتوں یا ایک ماہ تک ہوتا تھا۔ ہر رکن مع شریک حیات اس میں شریک ہوتا اور اپنے ساتھ کوئی ایک چیز پکا کر لاتا اور سب مل کر اپنے اپنے ساتھ لائے ہوئے انواع و اقسام کے کھانوں سے شاد کام ہوتے، عمدہ عمدہ گفتگوئیں رہتیں اور کبھی کوئی بیرونی مہمان کسی ملک یا شہر سے آ جاتا تو اسے بھی مدعو کر لیا جاتا اور اس سے اس کی تخلیقات بھی سنی جاتیں۔ ادا جعفری نے آتے ہی مشفق خواجہ کو بھی اس حلقے کا رکن بنا لیا۔ ایک تو شام کا وقت، اچھی پر لطف محفل، عمدہ صحبت اور پھر ہم ذوق اور ہم مزاج افراد کا اجتماع، یہ دوسرا محرک ہے جس نے خواجہ صاحب کو ان کے اپنے معمولات سے دور کر دیا۔ پہلے وہ کبھی کبھار شاموں میں تقریبات میں شریک ہوا کرتے تھے، اب وہ تواتر سے، بلا ناغہ حلقے کی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ پھر یہی نہیں بل کہ اس حلقے کے وابستگان کی ذاتی اور نجی تقریبات میں بھی اب شرکت کرنے پر مجبور یا آمادہ ہونے لگے۔

چناں چہ اب ان کی شامیں ایسی ہی تقریبات میں گزرنے لگیں اور دن میں بھی وہ اس حلقے کے اراکین سے کسی سبب ملنے ملانے پر مجبور ہوتے رہے۔ اب اس طرح تحقیق کے لیے جو یکسوئی، دل جمعی اور مستقل مزاجی ضروری تھی اور جو آزادانہ وقت اس کے لیے لازمی تھا، اب خواجہ صاحب کی ترجیحات میں نہ رہا۔ اب ان کی شامیں غالب لائبریری میں نہ گزرتیں اور دن تحقیق کی گتھیوں میں نہ الجھتا۔ *تخلیقی ادب* کے بعد اس حلقے یا سلسلے نے انھیں تحقیق سے مزید دور کر دیا۔ اب ان کا قدیمی حلقۂ احباب بھی وہ نہ رہا جن سے صحبتوں اور ملاقاتوں میں تحقیقی معاملات اور منصوبے اور مآخذ و مصادر زیرِ گفتگو رہتے، اب خواجہ صاحب کی صحبتوں میں وہ لوگ رہتے یا خواجہ صاحب اب ان لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے جن کو تحقیق سے کوئی دل چسپی اور موانست نہ تھی۔ تحقیقی معمولات اور مزاج پر یقیناً صحبتوں کی اس تبدیلی کا اثر بھی ایک قابلِ فہم امر ہے۔

تخلیقی ادب نے سات آٹھ سال مشفق خواجہ کو اپنے جال یا سحر میں گھیرے رکھا تھا۔ مالی وسائل جب مسئلہ بننے لگے اور پھر جب *تخلیقی ادب* کی مقبولیت و شہرت بھی اپنے بامِ عروج پر پہنچ گئی اور اب اس میں مزید کسی عروج یا افادیت کا امکان نہ رہا تو خواجہ صاحب نے اس کی طرف سے توجہ کم کر لی اور اسے غالب لائبریری کے مجلّے *غالب* میں ایک طرح سے ضم کر دیا، جس کا مجموعی مزاج، مرزا ظفر الحسن کے انتقال اور ان کے دور کے مجلّہ سہ ماہی *غالب* کے بند ہونے کے بعد، خواجہ صاحب کی زیرِ نگرانی *تخلیقی ادب* کے عین مطابق رہا۔ اور جو ایک نفسیاتی تسکین کا عنصر *تخلیقی ادب* میں انھیں مل رہا تھا، وہ اب *غالب* سے حاصل ہونے لگا۔ اگرچہ حلقے یا سلسلے کی تقریبات بھی نورالحسن جعفری کی رحلت کے بعد اور ادا جعفری صاحبہ کی ضعیف العمری کی وجہ سے تواتر میں نہ رہیں۔ لیکن انھوں نے مشفق خواجہ کے مزاج و معمولات اور دل چسپیوں و دل بستگیوں میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا، ان سے واپسی خواجہ صاحب کے لیے ممکن نہ رہی۔ پھر اب یہ دوران کی علالت و عوارض کا دور بھی ہے۔ *تخلیقی ادب* اور حلقے اور سلسلے کو غیر شعوری طور پر جو کچھ خواجہ صاحب سے لینا تھا، لے لیا۔ اب ان کی دیرینہ بیماری ذیابیطس اور اس سے لاحق عوارض نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ تحقیق کے لیے جو انہماک، لگن، جستجو اور مستقل مزاجی ضروری تھی وہ اب باقی نہ رہی۔ ان سب نے مل کر دراصل ہم سے ایک ایسے شخص کو چھین لیا، جس میں اپنے دور کا ایک بڑا محقق بننے کے سارے امکانات موجود تھے۔ ان کی زندگی کے یہ انقلابی موڑ دورِ حاضر کی

اردو تحقیق کے لیے مایوس کن بلکہ الم ناک ثابت ہوئے۔ معاصر نے خواجہ صاحب کی زندگی بدل کر رکھ دی اور پھر رہی سہی کسر ادا جعفری کے حلقے یا سلسلے نے پوری کر دی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مشفق خواجہ، *ابیات* (کراچی: مکتبۂ نیا دور، ۱۹۷۸ء)؛ دوسری اشاعت خواجہ صاحب کے برادرِ خورد عبدالرحمٰن طارق نے خود اپنی دل چسپی سے شائع کی (لاہور: القمر انٹر پرائز، ۲۰۰۹ء)۔

۲۔ مشفق خواجہ، *جائزۂ مخطوطاتِ اردو* (لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

۳۔ مشفق خواجہ، *تحقیق نامہ* (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء)۔

۴۔ مشفق خواجہ، *غالب اور صفیر بلگرامی* (کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۱ء)۔

۵۔ مشفق خواجہ، مرتب، *تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا*، جلد اول (لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۰ء؛ جلد دوم، ۱۹۷۲ء)۔

۶۔ احمد دین، *اقبال*، مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۷۹ء)۔

۷۔ مشفق خواجہ، مرتب، *کلیاتِ یگانہ* (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء)۔

۸۔ مشفق خواجہ، ''علم الاقتصاد: اقبال کا پہلا علمی کارنامہ''، *اردو* (جولائی۔اکتوبر ۱۹۶۰ء): ۱۷۸۔۱۶۱؛ مشفق خواجہ، ''خطاطی کے چند نادر نمونے''، *اردو* (جولائی۔ستمبر ۱۹۶۶ء): ۴۳۔۲۹؛ مشفق خواجہ، ''گلشنِ سخن پر ایک نظر''، *اردو* (جولائی۔ستمبر ۱۹۶۷ء): ۱۴۶۔۱۳۳؛ مشفق خواجہ، ''مرزا محمد قزلباش خان امید''، *اردو* (اپریل۔جون ۱۹۷۷ء): ۵۹۔۲۵۔

۹۔ مشفق خواجہ، ''غالب اور صفیر بلگرامی''، *صحیفہ* (جولائی ۱۹۶۹ء): ۷۲۔۴۰؛ قسط دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء): ۲۹۔۱۔

۱۰۔ مشفق خواجہ، ''اقبال اور مولوی احمد دین''، *اقبال ریویو* (جولائی ۱۹۶۷ء): ۷۰۔۲۳۔

۱۱۔ مؤقر جرمن مستشرق: **Carl Brokelmann** جس کی بنیادی شہرت عربی مخطوطات کے معروف کیٹلاگ:

Geschichte der Arabischen Litteratur,

Zweite den Supplementbänden angepaßte Auflage

کے باعث ہے۔ اس کیٹلاگ کی ترتیب کا آغاز ۱۸۹۸ء سے شروع ہوا تھا جب کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کی دو ضخیم جلدیں اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۹ء تک ان کے تین ضخیم ضمیمے **E.J. Brill** لائڈن سے شائع ہوئے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے شاگردوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور دس تازہ ضخیم جلدوں میں اسے مرتب کیا۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں اس کیٹلاگ اور اس میں عربی زبان و ادب اور علوم پر پیش کردہ معلومات اور اسکالرشپ کی ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔ یا

عالمی سطح پر عربی کے تعلق سے اس سے بہتر اور معلوماتی و محققانہ کیٹلاگ کوئی اور نہیں۔

۱۲۔ ممتاز انگریز اسکالر، C. A. Storey جس نے فارسی زبان وادب اور علوم کا کیٹلاگ:

Persian Literature: A Bio-Bibliographical Survey

مرتب کیا جو متعدد جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۹۵۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن سے شائع ہوئی تھی، جب کہ اسٹوری کی وفات کے بعد اس کی یادداشتوں کی بنیاد پر، بقیہ جلدیں سوسائٹی سے منسلک اسکالر جیسے **Francois de Blois** تا حال مرتب اور شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی جلد پنجم، حصہ سوم ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کیٹلاگ فارسی زبان وادب اور علوم پر مبنی مخطوطات و مطبوعات اور ان کے مصنفین کے احوال و آثار کے لیے بے حد معلوماتی و مفید ہے۔

۱۳۔ مشفق خواجہ، ''جسونت سنگھ پروانہ،'' (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۵ء): ۱۱۷۔۸۴؛ مشفق خواجہ، ''ثناءاللہ خاں فراق،'' (اپریل تا جون ۱۹۷۵ء): ۸۱۔۴۹؛ مشفق خواجہ، ''حافظ فضل علی ممتاز،'' (جولائی۔ستمبر ۱۹۷۵ء): ۴۴۔۲۵؛ مشفق خواجہ، ''خواجہ احسن الدین خان بیان،'' (جنوری۔مارچ ۱۹۷۶ء): ۱۷۹۔۱۴۳۔

۱۴۔ مشفق خواجہ، ''نگارستان بشیر،'' *اردو* (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۱ء): ۸۷۔۶۹۔

۱۵۔ مشفق خواجہ، ''گلشنِ مشتاق،'' *اردو* (اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۷۴ء): ۴۲۔۱۷۔

۱۶۔ معین الدین عقیل، ''مشفق خواجہ کے آخری دس دن،'' *مکالمہ* ۱۵ (جولائی ۲۰۰۵ء۔جون ۲۰۰۶ء): ۱۹۲۔۱۸۵؛ معین الدین عقیل، ''رقعاتِ مشفق خواجہ،'' *الزبیر* ۳۔۲ (اکتوبر ۲۰۰۷ء): ۹۶۔۸۰۔

۱۷۔ خواجہ عبدالوحید، *یادِ ایام*، مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء)؛ آغا حسن امانت، ''فرمان سلیمانی''، مرتبہ مشفق خواجہ *جریدہ* ۳۷ (۲۰۰۶ء): ۱۹۷۔۲۱؛ اولاً اس کا مقدمہ ایک مقالے کے طور پر شائع کرایا تھا: ''فرمان سلیمانی،'' نذرِ حمید، مرتبہ، مالک رام (دہلی: مجلس نذرِ حمید، ۱۹۸۱ء)، ۳۵۴۔۳۰۵۔

مآخذ

امانت، آغا حسن۔ ''فرمان سلیمانی۔'' *جریدہ* ۳۷ (۲۰۰۶ء): ۱۹۷۔۲۱۔

خواجہ، مشفق۔ *ادبیات*۔ کراچی: مکتبۂ نیا دور، ۱۹۷۸ء۔

خواجہ، مشفق۔ *ادبیات*۔ اشاعت دوم۔ لاہور: القمر انٹرپرائز، ۲۰۰۹ء۔

خواجہ، مشفق۔ *تحقیق نامہ*۔ لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔

خواجہ، مشفق۔ *جائزہ مخطوطات اُردو*۔ لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔

خواجہ، مشفق۔ *غالب اور صفیر بلگرامی*۔ کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۱ء۔

خواجہ، مشفق۔ مرتبہ *تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا*۔ جلد اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء۔

خواجہ، مشفق۔ مرتبہ *کلیاتِ یگانہ*۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء۔

خواجہ، مشفق۔ ''اقبال اور مولوی احمد دین۔'' *اقبال ریویو* (جولائی ۱۹۶۷ء): ۷۰۔۲۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''ثناءاللہ خاں فراق۔'' *مکالمہ* (اپریل تا جون ۱۹۷۵ء): ۸۱۔۴۹۔

خواجہ، مشفق۔ ''جسونت سنگھ پروانہ۔'' *مکالمہ* (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۵ء): ۱۱۷۔۸۴۔

خواجہ، مشفق۔ ''حافظ فضل علی ممتاز۔'' *مکالمہ* (جولائی۔ستمبر ۱۹۷۵ء): ۴۴۔۲۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''خطاطی کے چند نادر نمونے۔'' *اردو* (جولائی۔ستمبر ۱۹۶۶ء): ۴۳۔۲۹۔

خواجہ، مشفق۔ ''خواجہ احسن الدین خان بیان۔'' *مکالمہ* (جنوری۔مارچ ۱۹۷۶ء): ۱۷۹۔۱۴۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''علم الاقتصاد: اقبال کا پہلا علمی کارنامہ۔'' *اردو* (جولائی۔اکتوبر ۱۹۶۰ء): ۱۷۸۔۱۶۱۔

خواجہ، مشفق۔ ''غالب اور صفیر بلگرامی۔'' *صحیفہ* (جولائی ۱۹۶۹ء): ۷۲۔۴۰؛ قسط دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء): ۲۹۔۱۔

خواجہ، مشفق۔ ''فرمان سلیمانی۔'' نذرِ حمید، مرتبہ مالک رام (دہلی: مجلس نذرِ حمید، ۱۹۸۱ء)، ۳۵۴۔۳۰۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''گلشنِ سخن پر ایک نظر۔'' *اردو* (جولائی۔ستمبر ۱۹۶۷ء): ۱۴۶۔۱۳۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''گلشنِ مشتاق۔'' *اردو* (اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۷۴ء): ۴۲۔۱۷۔

خواجہ، مشفق۔ ''مرزا محمد قزلباش خان امید۔'' *اردو* (اپریل۔جون ۱۹۷۷ء): ۵۹۔۲۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''نگارستان بشیر۔'' *اردو* (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۱ء): ۸۷۔۶۹۔

دین، احمد۔ *اقبال*۔ مرتبہ مشفق خواجہ۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۹ء۔

عبدالوحید، خواجہ۔ *یادِ ایام*، مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء)۔

عقیل، معین الدین۔ ''رقعاتِ مشفق خواجہ۔'' *الزبیر* ۳۔۲ (اکتوبر ۲۰۰۷ء): ۹۶۔۸۰۔

عقیل، معین الدین۔ ''مشفق خواجہ کے آخری دس دن۔'' *مکالمہ* ۱۵ (جولائی ۲۰۰۵ء۔جون ۲۰۰۶ء): ۱۹۲۔۱۸۵۔

Brokelmann, Carl. ***Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplementbänden angepaßte Auflage*****. Leiden: E. J. Brill.**

Storey, C. A. ***Persian Literature: A Bio-Bibliographical Survey*****. London: Royal Asiatic Society.**